# مقالات

# رسالت

از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

**فطرت انسانی کے سوالات**

انسان کی فطرت کے کچھ سوالات ہیں جو رہ رہ کر اسکی گہرائیوں سے اٹھتے ہیں۔ ان سوالات کو نہ حیلوں بہانوں سے ٹالا جاسکتا ہے، نہ انکے جواب سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔ اِس عالم کو کون چلا رہا ہے؟ اُسکی کیا صفات ہیں؟ اُسکا ہم سے اور ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟ اس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ اور یہ کہ اس زندگی کا انجام اور اس عالم کا منتہا کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو بالکل طبعی اور قدرتی ہیں اور انسان کی فطرتِ سلیم کو پورا حق ہے کہ وہ انسان سے پوچھے کہ وہ جس دنیا میں بستا ہے اسکو کس نے بنایا اور کون اسکو چلا رہا ہے۔ پھر جب تک اسکو اس بنانے والے کی صفات نہ معلوم ہوں، اس کو اس سے کوئی قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق نہیں پیدا ہو سکتا۔ دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کسی شخص کی سیرت اور اخلاق و صفات سے ہمیں واقفیت نہیں ہوتی ہمیں محض اسکے نام سے تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر ہم خالق کائنات کے متعلق اسکے سوا کہ وہ موجود ہے کچھ نہ جانتے ہوں، اسکی ربوبیت و رحمت، قدرت و اختیار، علم و اطلاع، محبت و رافت، اور اسکے جلال و جمال کی دوسری صفات، اسکا ہم سے قریب ترین تعلق، اور ہماری اسکی طرف شدید ترین احتیاج، اور اسکے سہارے ہمارے قیام و بقا کا حال معلوم نہ ہو، اس سے ہمیں وہ تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو ایسی ذات سے پیدا ہونا چاہیے۔

اسی طرح وہ اپنے اس سوال میں بالکل حق بجانب ہے کہ زمین کی مملکت میں بسنے والوں سے صاحب مملکت کے کیا مطالبات ہیں۔ اس لیے کہ کسی سلطنت میں رہنے والوں کا یہ پہلا فرض ہے کہ اس کے سلطان کا نظام وقانون معلوم کریں۔

اسی طرح سے یہ بھی بالکل طبعی امر ہے کہ وہ اس زندگی کے متعلق جاننا چاہے کہ اسکا مآل کیا ہے اور اسکے بعد کیا ہوگا؟ اس لیے کہ اس سوال کا تعلق نہ صرف اسکے مستقبل سے ہے بلکہ اسکے حال سے بھی ہے۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہے جس میں پہلی زندگی کا حساب کتاب ہوگا، اور اس پہلی زندگی کے اعمال کے مطابق اسکو جزا و سزا ملے گی، اس شخص کا طرزِ عمل موجودہ زندگی میں اُس شخص سے بالکل مختلف ہوگا جو موجودہ زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اسلیے یہ سوال اسکی اِس زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اسکے جواب میں تاخیر کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس مسئلہ کو طے کیے بغیر اِس زندگی کی صحیح تشکیل نہیں ہو سکتی۔

ہماری زندگی کے یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر نجات وسعادت کا دار و مدار اور ہماری قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، جنکے جواب میں ذراسی غلطی اور لغزش ہماری ابدی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ زندگی ہم کو صرف ایک مرتبہ کے لیے ملی ہے اور یہ ہماری سب سے قیمتی متاع ہے۔ وہ محض قیاس وتخمین، اور آزمائش و تجربہ میں گذاری نہیں جا سکتی۔

ان سوالات کے علاوہ کچھ سوالات اور بھی ہیں اور اُنکا تعلق بھی ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ ہمارا اپنے گرد و پیش کی دنیا سے اور اسکا ہم سے کیا تعلق ہے؟ اس ہنگامۂ ہستی میں ہماری حیثیت اور ہمارے وجود کا مقصد کیا ہے؟ ہم ماتحت ہیں یا خود مختار؟ ذمہ دار ہیں یا غیر ذمہ دار؟ اگر ذمہ دار ہیں تو کس کے سامنے اور ہماری ذمہ داری کس حد تک ہے؟ ہماری قوتیں اور صلاحتیں

ہماری اپنی ہیں یا کسی دوسرے کی ملک ؟ انکا طریق استعمال کیا ہے ؟ اس زندگی کا کمال مطلوب اور منتہائے نظر کیا ہے ؟ اور ایسے متعدد سوالات ہیں، جو ہمارے لیے فطری طور پر حل طلب ہیں اور زندگی کے مرکزی سوالات ہیں۔

**سوالات کے جواب کی دو راہیں** ان سوالات کے جواب کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ انکا جواب ہم اپنے ذاتی علم و فہم اور غور و فکر کی بنا پر خود دیں۔ لیکن اس طریقہ سے ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں وہ یہ ہوگا کہ اس عالم کا کوئی بنانے والا ضرور ہے۔ رہا یہ سوال کہ اُسکی صفات کیا ہیں ؟ تو اسکا جواب ہم اپنے ذاتی تفکر کی بنا پر نہیں دیسکتے۔ ہمارا دماغ اپنی انتہائی بلند پروازیوں میں بھی قیاس کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اور یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس میں قیاس کی گنجائش نہیں، اسلیے کہ خالق و مخلوق کے درمیان کوئی مشابہت ہی نہیں ہے کہ عالم خلق کی مشہود و محسوس اشیاء کو دیکھ کر خالق کی صفات کا تصور کیا جا سکے۔

اسکے بعد دوسرا مشکل سوال اسکا تعیُّن ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، کیا اسکو پسند ہے اور کیا ناپسند۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دوستوں اور عزیزوں اور خاص رفیقوں کی خوشی، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بارہ میں بھی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے اور اس میں بعض مرتبہ بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک نادیدہ ذات اور وراء الوراء ہستی کی مرضیات و نامرضیات کی یقینی تعیین محض قیاس سے کس طرح ممکن ہے۔

پھر اس علم و فہم اور غور و فکر کا نتیجہ ایک نہیں ہے۔ نتیجہ میں سخت اختلاف و تعارض ہے۔ کسی نے اپنے غور و فکر کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کارخانہ بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا اور بغیر کسی چلانے والے کے چل رہا ہے اور خود ہی ختم ہو جائیگا۔ کسی کے نزدیک اسکا اگر کوئی صانع ہے تو اسکا اب مصنوعات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ کسی کے نزدیک اسکا صانع ہی اسکا حقیقی مالک تھا مگر اب وہ دوسروں کے حق

میں اپنے مالکانہ حقوق سے دست بردار ہوگیا ہے اور اسکی مملکت میں اب وہ بادشاہی کر رہے ہیں۔ کسی نے اس دنیا کی ہر چیز کو جس سے اسکو بظاہر نفع و ضرر پہونچتا ہے یا پہونچ سکتا ہے اپنا اِلٰہ (معبود) اور ہر صاحب طاقت کو اپنا حاکم بنالیا، اور اسکے ظاہری حواس، روزمرہ کے تجربات اور عقل و فہم نے اسکو اسی نتیجہ پر پہونچایا۔ کسی کے نزدیک انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جو کچھ ضرورتیں رکھتا ہے اور کچھ خواہشیں وہ آزاد و خود مختار ہے اور قطعاً غیر مسئول۔ اسکی طاقت غیر مقید اور اسکا اختیار غیر محدود ہے۔ اسکے قانون کا نہ کوئی الٰہی ماخذ ہے نہ اسکے علم کا کوئی غیبی سرچشمہ۔ دنیا ایک ہنگامۂ کارزار ہے جس میں اصل قانون طاقت ہے، اخلاق، خیر و شر، حسن و قبح یہ سب بے معنی الفاظ ہیں[1]۔

خدا کی ہستی کو تسلیم کرنیکے بعد اسکے صفات کے بارہ میں حکماء اور فلاسفہ نے جو جو قیاس آرائیاں اور موشگافیاں کی ہیں اور جس طرح انہوں نے اسکی طرف اُن نقائص کی نسبت کی ہے جنکی نسبت وہ خود اپنی طرف پسند نہیں کرتے وہ انسانی عقل کے عجائبات میں سے ہے[2]۔

بعد کے سوالات یعنی اس عالم میں انسان کا اصل محل و مقام کیا ہے، اسکی حیثیت و مقصد کا تعین، دوسری مخلوقات اور اپنے ہم جنسوں سے اسکے طرزِ عمل کی تعیین، ماتحتی اور خود مختاری، ذمہ داری اور آزادی کی بحث، اپنی قوتوں اور ظاہری ملکیتوں کے متعلق اسکا خیال، یہ سب درحقیقت پہلے سوالات کا ضمیمہ ہیں اور اُنکے صحیح حل سے یہ خود بخود حل ہوجاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ابتدائی سوالات کے حل کرنے میں غلطی کی اور قیاس آرائی سے کام لیا، ان سوالات کے جواب میں بھی انکا غلطی میں مبتلا ہونا اور انکے قیاسات میں اختلاف و تعارض اور شک و احتمال واقع ہونا لازمی تھا۔

---

۱؎ یہ سب اقوال و عقائد جاہلیت اولیٰ، جاہلیت وسطیٰ اور جاہلیت جدیدہ کے عقلا اور فلاسفہ کے ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں کتب فلسفہ و ما بعد الطبیعیات

۲؎ ملاحظہ ہوں اقوال حکماء یونان، و ابن سینا و ابن رشد۔

جواب کی دوسری راہ یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں کسی دوسری جماعت پر اعتماد کریں - لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت کونسی ہے؟ اگر وہ حکماء کی جماعت ہے، تو پوچھا جا سکتا ہے کہ ان مسائل میں انکو ہمارے مقابلہ میں کونسا امتیاز حاصل ہے اور ان مابعد الطبیعیاتی مسائل کے حل کے انکے پاس کونسے علمی ذرائع ہیں؟ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسائل میں نہ حواس کام کرتے ہیں نہ عقل کا کچھ دخل ہے انکو اس علم کے مبادی بھی حاصل نہیں ہیں - پھر انکو اس بارہ میں ہماری رہنمائی کا کیا حق ہے اور ہم ان پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟ ان سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے:

| | |
|---|---|
| هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجْتُمْ | تم نے اُن مسائل میں تو بحث کر لی جنکا تم کو |
| فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ | (تھوڑا بہت) علم تھا - مگر اب ایسے مسائل میں کیوں |
| فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ | بحث کرتے ہو جنکا تمکو کچھ بھی علم نہیں؟ — اللہ جانتا |
| وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (آل عمران) | ہے تم نہیں جانتے - |

اب صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ان مسائل میں ہم کچھ ایسے انسانوں پر اعتماد کریں جنکا علم اس بارہ میں قیاسی نہو بلکہ یقینی اور قطعی ہو، جنہوں نے ان علوم و حقائق کو اپنے مشاہدہ سے اس طرح حاصل کیا ہو جس طرح ہم کو اس عالم کے مسموعات و مبصرات کا علم ہوتا ہے، جن کے لیے یہ چیزیں ایسی ہی بدیہی ہوں جیسی ہمارے لیے دنیا کی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، جنکو مشترک انسانی حواس کے علاوہ ایک حاسۂ زائد ملا ہو جسے ہم حاسۂ غیبی کہہ سکتے ہیں، جو خدا سے براہ راست اسکی مرضیات اور احکام معلوم کر سکیں اور دوسرے انسانوں تک پہونچا سکیں - یہ صرف پیغمبروں کی جماعت ہے - انکی بے داغ سیرت، انکی بے لاگ صداقت، انکی فوق البشری حکمت و عدالت، اُنکی معجزانہ تعلیم اس بات کا اذعان پیدا کر دیتی ہے کہ یہ ایک الگ نوع کے لوگ ہیں اور انکا علم و اطلاع کے اُس سرچشمہ سے ضرور اتصال ہے جو انسانوں کی دسترس سے باہر ہے - اُنکے خارق عادت صفات و علوم کی کوئی

توجیہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ ان کا نبی ہونا اور اُنکے پاس وحی کا آنا تسلیم کیا جائے۔

سابق الذکر جماعتیں (حکماء و فلاسفہ) اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا خود بھی دعویٰ نہیں کرتیں، نہ انکو اس بارہ میں کسی مشاہدہ کا دعویٰ ہے۔ انکے اقوال و دعاوی کا حاصل بس یہ ہے کہ ایسا ہوگا، یا ایسا ہونا چاہیئے، یا ہمارے قائم کیے ہوئے مقدمات (جو بدیہی اور قطعی الثبوت نہیں ہیں) ہم کو اس نتیجہ پر پہونچاتے ہیں۔ اور وہ اسکے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔

لیکن پیغمبروں کو اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا دعویٰ ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کہتے کہ خدا ہے یا اسکی یہ صفات ہیں۔ بلکہ وہ اسکے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اسکی باتیں سنتے ہیں، ہم اس سے ہمکلام ہوتے ہیں، ہمارے پاس اسکے پیغام پہونچتے ہیں، ہمارے پاس اُسکے فرشتے آتے ہیں۔ اُنکے لیے کوئی چیز اتنی یقینی اور بدیہی نہیں جتنی خدا کی صفات، اسکے احکام و پیغام اور اپنی نبوت و رسالت۔ اسلیے انکو ایک لحہ کے لیے بھی ان حقائق میں کوئی شک و تذبذب نہیں اور کسی کے کہنے سننے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

پیغمبر نبوت و رسالت کے اس بلند مقام پر کھڑا ہوتا ہے جہاں سے وہ عالم غیب کو بھی اُسی طرح دیکھتا ہے جس طرح عالم شہود کو، عالمِ آخرت بھی اسکے سامنے اسی طرح ہوتا ہے جس طرح یہ دُنیا۔ جو لوگ اس بلندی پر نہیں ہیں اور زمین کی پستی سے اسکے مشاہدات کے بارہ میں اُس سے بحث و حجت کرتے ہیں وہ ان سے اسکے سوا کیا کہہ سکتا ہے کہ میری آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میرے کانوں میں وہ آوازیں آتی ہیں جو تم نہیں سن سکتے، تمہارے لیے اسکے سوا چارہ نہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھکر اور کانوں سے سُنکر جو کچھ کہوں تم اسکا یقین کرو، تمہاری نجات اسی میں ہے[1]۔

[1] کوہ صفا کی تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اہم نکتہ کو جو پیغمبر اور غیر پیغمبر کے فرق کو واضح کرتا ہے نہایت دلنشیں انداز میں بیان فرمایا۔ آپ نے پہاڑ پر کھڑے ہو کر قوم سے پوچھا کہ تم نے آج تک مجھے کیسا پایا؟ سب نے بالاتفاق کہا کہ ہم نے آپکو ہمیشہ سچا اور راست معتمد پایا۔ پھر آپ نے کہا کہ اچھا اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے عقب میں ایک لشکر پڑا ہوا ہے جو غفلت کی حالت میں تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تم اسکو باور کروگے؟ لوگوں نے کہا کہ اسکے یقین نہ کرنیکی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں (اسلیے کہ ہم آپکی صداقت کا تجربہ ہے اور آپ ایسے بلند مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپکو وہ نظر آسکتا ہے جو ہمکو نظر نہیں آسکتا)۔ اس اقرار کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کا عذاب آنے والا ہے۔ اس حقیقت افروز پیغمبرانہ تقریر میں آپنے پیغمبری کی انہیں دونوں [illegible])

ایک پیغمبر[1] سے جب اسکی قوم نے خدا اور اسکی صفات کے بارہ میں حجت کی تو اس نے نہایت سادگی سے اپنا اور بے دلیل بحث کرنے والوں کا فرق بیان کیا

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ (انعام)

اور اس سے اسکی قوم نے حجت کی۔ اس نے کہا کہ کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے میری رہنمائی کی ہے؟

ایک دوسرے پیغمبر[2] نے بھی فرق اس طرح بیان کیا:

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ (ہود)

اس نے کہا کہ لوگو! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کے صاف راستہ پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی پھر وہ تمہاری نظر سے مخفی رہی تو کیا ہم تمکو اس پر مجبور کرسکتے ہیں جبکہ تم اسکو پسند نہیں کرتے۔

ایک تیسرے پیغمبر[3] کے متعلق یوں کہا گیا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم-۱)

وہ اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا وہ تو وحی ہے جو وحی کی جارہی ہے۔

اسی مشاہدہ کے متعلق کہا گیا:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ (النجم-۱)

نہ اسکی نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔ بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (النجم-۱)

رسول کے دل نے جھوٹ نہیں کہا جو کچھ کہ دیکھا۔ کیا تم اس سے جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس پر جھگڑتے ہو؟

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) خصوصیتوں کی وضاحت فرمائی۔ ایک اسکی اعلیٰ صداقت اور پاکیزہ سیرت۔ دوسرے اسکی خداداد پیغمبرانہ بصیرت اور مشاہدہ غیبی جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں اور جسکی بنا پر دوسرے انسانوں کے لیے اسکی تقلید کے سوا چارہ نہیں۔

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام

[2] حضرت ہود علیہ السلام

[3] حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اس یقین و مشاہدہ کے مقابلہ میں جو کچھ ہے اسکی حقیقت سُن لیجیے ۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (النجم-۱)

وہ محض اٹکل اور دل کی خواہشوں پر چلتے ہیں حالانکہ انکے پاس انکے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم-۲)

ان کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں، وہ محض اٹکل پر چلتے ہیں اور قیاس حقیقت کا قائمقام نہیں ہو سکتا ۔

**زندگی کی مکمل توجیہ وحی اور پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں**

اُن مابعد الطبیعیاتی سوالات کے علاوہ جنکا جواب کے بغیر ہماری زندگی حیوانی زندگی سے ممتاز نہیں ہو سکتی، ہم یوں بھی وحی کی روشنی اور پیغمبروں کے نورِ بصیرت کے بغیر اپنی زندگی کی مکمل توجیہ نہیں کر سکتے اور نظامِ کائنات کے حقیقی مرکز اور اُس ہمہ گیر اور حکیمانہ قانون کو دریافت نہیں کر سکتے جو اس عالم میں کارفرما ہے ۔ اپنی ذاتی بصارت سے ہم کو یہ زندگی ایک وحدت کے طور پر نظر نہ آئیگی، بلکہ ایک منتشر شیرازہ ملیگا جسکے اوراق بکھرے ہوئے ہیں ۔ اسکی کچھ سطریں اور اسکے بعض عنوانات ہم غور کر کے پڑھ سکتے ہیں ۔ مگر اس صحیفہ کائنات کا موضوع، اس کتاب کا خلاصہ، اسکے مصنف کا مافی الضمیر ہم کو پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا ۔

حکماء اور ماہرینِ طبعیات نے کائنات سے متعلق جو تحقیقات کی ہیں، زندگی سے متعلق جن حقائق کا انکشاف کیا ہے، طبعی قوتوں کو اپنے علم و تجربہ سے انسان کے لیے جس طرح مسخر کیا ہے اور جس طرح کائنات کے ایک ایک شعبہ اور زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لیے مستقل علوم مرتب کیے اور کتب خانے فراہم کر دیے ہیں وہ بلاشبہ انسانی علم کا ایک کارنامہ ہے ۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہے یہ زندگی اور کائنات کے اصل مجموعہ کے کسور و اجزا ہیں جن میں باہم کوئی ربط نہیں ہے، نہ انکا کوئی مرکز معلوم ہے ۔ یہ

سب کس نظام کے ماتحت ہیں؟ کس مقصد کے تابع ہیں؟ کس اہم غرض کے خادم ہیں؟ ان سوالات کا کوئی جواب حکماء اور طبعیین کے پاس نہیں ہے۔ حالانکہ علمی حیثیت سے ہمارے لیے یہی سوالات زیادہ اہم ہیں، اور عملی حیثیت سے بھی انکی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ اخلاق، طرزِ عمل اور زندگی کے بنیادی نقطۂ نظر کا انحصار انہی سوالات پر ہے۔ حکماء اور طبعیین نے اپنا سفر اصلی نقطۂ آغاز (خالق کی معرفت) سے شروع نہیں کیا، اس لیے وہ ہمیشہ آفاق میں گم رہینگے اور زندگی کے معمہ کو کبھی حل نہ کر سکینگے۔

لیکن اسکے بالکل برخلاف جب ہم وحی کی روشنی اور پیغمبر کی بصیرت سے اس عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایک "وحدت" نظر آتا ہے اور ایک اعلیٰ وحدانی نظام معلوم ہوتا ہے جسکے اجزاء میں باہم پورا ربط و تعلق ہے، یہ سب ایک مرکز کے تابع ہیں، انکی ہر حرکت و عمل ایک مقصد کے ماتحت ہے، ان میں نہ باہمی تصادم ہے، نہ خود مرکزیت، دنیا ایک مرتب و متوازن مشین ہے جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کارآمد ہے اور دوسرے پرزہ کی امداد کر رہا ہے، یا ایک بڑا کارخانہ ہے جس میں صدہا مشینیں چل رہی ہیں، ہر مشین کو دوسری مشین سے پورا تعلق ہے اور یہ پوری مشین یا پورا کارخانہ ایک صاحب علم و صاحب اختیار طاقت کے ہاتھ میں ہے جو اس کو ایک قانون اور نظام کے ماتحت جو اُسی کا وضع کیا ہوا ہے چلا رہا ہے۔

**انبیاء اور محققین کے طریق نظر اور طریق کار کا اختلاف**

انبیاء اور حکماء و محققین کے طریق نظر اور طریق کار کا اس کائنات کے بارہ میں جو اختلاف ہے اسکی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں۔

کسی شہر میں علماء و محققین کی ایک جماعت داخل ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ یہ تحقیق کرتا ہے کہ اس شہر کا محل وقوع کیا ہے، اسکے حدود اربعہ کیا ہیں، اسکا عرض البلد اور طول البلد کیا ہے اسکے پاس کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں، دریا کہاں سے آتے ہیں اور پہاڑ کہاں تک جاتے ہیں، شہر کا رقبہ کیا ہے، وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جغرافیہ دانوں کا گروہ ہے۔ دوسرا گروہ یہ دریافت

کرتا ہے کہ یہ شہر کب سے آباد ہے، شہر میں کون کون سے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں، انکی تاریخ کیا ہے۔ یہ مورخین اور علمار آثار کی جماعت ہے۔

کچھ لوگ اسکی زمین کی حیثیت معلوم کرتے ہیں: کھدائیاں کرتے ہیں اور اسکی معدنیات دریافت کرتے ہیں۔ یہ ماہرین طبقات الارض کا گروہ ہے۔

کچھ لوگ وہاں ایک رصدگاہ قائم کرتے ہیں جہاں سے سیاروں اور ثوابت کا مطالعہ کرتے ہیں، انکے زمین سے فاصلے دریافت کرتے ہیں، زلزلوں اور بارشی ہواؤں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ یہ علمار طبعیات وہیئت کی جماعت ہے۔

کچھ لوگ وہاں کیمیائی معمل قائم کرتے ہیں، جہاں ادویہ کے خواص کا تجربہ کرتے ہیں، مفردات و مرکبات کا تجزیہ کرکے نئی نئی تحقیقات کرتے ہیں۔ یہ علم الکیمیا اور نباتات کے ماہر ہیں۔

کچھ لوگ شہر کی زبان کے متعلق تحقیق کرتے ہیں، اسکے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اسکے لغت کی تدوین اور اسکے قواعد وضع کرتے ہیں۔ یہ ادبا اور علمار السنہ کی جماعت ہے۔

کچھ صاحب ذوق ان خشک مباحث سے ہٹ کر جمالیات کی طرف توجہ کرتے ہیں، پھولوں، پتیوں، اور مناظر طبعی کا لطف اٹھاتے ہیں اور انکے متعلق موثر و دلفریب پیرایہ میں اظہار تأثر کرتے ہیں۔ یہ شعرا کی جماعت ہے۔

کچھ لوگ وہاں کے عادات و رسوم اور اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں اور انکی تنقید کرتے ہیں۔ وہ سراغ لگاتے ہیں کہ یہ عادات و رسوم ان میں کہاں سے داخل ہوئے، کس طرح پیدا ہوئے، ان میں سے کون صحیح ہیں اور کون قابلِ اصلاح۔ یہ علمار اجتماع و اخلاق ہیں۔

کچھ لوگ شہر کے متعلق کچھ اصلاحات پیش کرتے ہیں، شہر کی تنظیم و ترقی اور اہل شہر کی راحت رسانی کے لیے ان کے پاس کچھ تجاویز ہوتی ہیں۔ یہ علمار تمدن ہیں!

یہ سب جماعتیں اپنے اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہیں اور دلچسپی اور انہماک کے ساتھ اپنے اپنے شعبوں کی تحقیقات کرنے لگتی ہیں۔

اب ایک شخص اس شہر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ پورے شہر پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے وہ دیکھتا اور سنتا سب کچھ ہے مگر مشغول کسی چیز میں نہیں ہوتا۔ اسکے نزدیک اہم سوالات یہ نہیں ہونے کہ شہر کا رقبہ کیا ہے، اسکی تاریخ کیا ہے، اسکی زمین کی تہہ میں کونسی معدنیات پائی جاتی ہیں، اور وہ دوسرے امور جو سابق الذکر جماعتوں کے نزدیک اہم تھے۔ اسکے سامنے اولین اور اہم ترین سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ شہر اس حسن و صنعت کے ساتھ کس نے تعمیر اور آباد کیا ہے؟ یہاں کس کی حکومت ہے؟ شہر کے باشندے کس کی رعیت ہیں؟ شہر کی آبادی اور عام زندگی سے شہر کے مالک اور حاکم کا کیا اور کیسا تعلق ہے؟ وہ حکومت اور رعیت کے درمیان واسطہ بنتا ہے، حکومت کا ترجمان اور اسکے احکام کا شارح ہوتا ہے۔ پس وہ تمام علمی اور تحقیقی جماعتیں مل کر بھی اس ایک شخص کی قائم مقام نہیں ہوسکتیں، اسکے بغیر یہ پورا شہر ایک عجائب خانہ اور سیرگاہ بنکر رہ جاتا ہے۔

انبیاء کا طریق نظر حکماء اور محققین سے اصولی طور پر جدا ہوتا ہے۔ انکا کام موجودات کے اسرار و حقائق کا انکشاف و تحقیق نہیں، انکا اصل موضوع "موجد کی ذات اور صفات اور اسکے احکام" ہے۔ صحیفۂ کائنات کے اوراق و صفحات انکے سامنے بھی اسی طرح کھلے اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح دوسرے اہلِ نظر کے سامنے۔ مگر انکی نظر کہیں اٹکتی الجھتی نہیں۔ انکا اس صحیفہ کے مصنف سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ وہ "آفاق" و "انفس" میں اسکی کھلی نشانیاں دیکھتے ہیں، اور اسکی سلطنت کا ایسا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس زمین و آسمان میں انکو صرف اسی کا حکم چلتا نظر آتا ہے، اور صرف اسی کی بادشاہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اسکا قانون انکو کسی گوشہ میں بھی ٹوٹتا نظر نہیں آتا، اسکا حکم کہیں بھی انکو ٹلتا دکھائی نہیں دیتا، تمام بلندیاں اسکے سامنے سرافگندہ دکھائی

دیتی ہیں اور تمام طاقتیں اسکے سامنے سپر افگندہ نظر آتی ہیں۔ ہر معاملہ میں اسی کا غیبی ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے، زمین و آسمان اسیکے سہارے تھمے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور اسکا "قیوم السموات والارض" ہونا انکے لیے عین الیقین بن جاتا ہے۔

یہی خدا کی وہ بادشاہی ہے جو انکو بے نقاب دکھائی دیتی ہے، جسکا علم سب سے بڑا علم اور حقیقۃ الحائق ہے، جس سے حکمار و محققین کے علوم کو ذرہ کی بھی نسبت نہیں، اور جسکے مقابلہ میں اُنکی حقیقت طفلانہ معلومات سے زیادہ نہیں :۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (انعام - ۹)

اسی طرح ہم ابراھیم کو آسمان اور زمین کی بادشاہی دکھاتے رہے تاکہ اس کو یقین آجائے۔

انبیاء کی فطرت، انکی عقل اور انکا قلب سلامت اور ذکاوت کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ انکی فطرت سلیم کا خاصہ ہے کہ انکو ہوش سنبھالتے ہی اس عالم کے خالق اور منتظم کی سچی جستجو اسکی طلب صادق پیدا ہوتی ہے اور انکی بیچین روح اور انکے مضطرب قلب کو اسوقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اسکو پا نہیں لیتے۔ انکی فطرت سلیم پہلے سے ان میں اسکا یقین پیدا کر دیتی ہے کہ اس عالم کا خالق و مالک اور انکا مربی کوئی ضرور ہے۔ وہ اس سے رہنمائی کے طلبگار رہتے ہیں اور اسکو اُسی کی مدد سے ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ عین تلاش و جستجو میں بھی اس سے علحدہ نہیں ہوتے اور کہتے ہیں :

لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (انعام - ۹)

اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی تو میں بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہونگا۔

انکی عقل سلیم کا خاصہ یہ ہے کہ انکو اس دنیا کی ہر نمود عارضی اور ہر بہار فانی معلوم ہوتی ہے

انکو تارے، چاند، سورج سب "آفل"، غروب ہو جانے والے، زوال پذیر اور شکست خوردہ معلوم ہوتے ہیں۔ انکو کسی کے متعلق دائمی اور ابدی، جاودان و بے خزاں ہونیکا دھوکا نہیں ہوتا۔ انکے قلبِ سلیم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ "آفل" کو اپنی محبت و عشق کے لائق نہیں سمجھتے اور اس سے دل لگانا پسند نہیں کرتے اور انکو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:۔

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (انعام - ۹) — میں غائب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

انکو حی و قیوم ذات کی تلاش ہوتی ہے، پھر جب وہ انکو مل جاتی ہے تو وہ اس علم کے بعد صبر نہیں کر سکتے اور پکار کر کہہ دیتے ہیں:

اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۝ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام - ۹)

میں ان سے بری ہوں جنکو تم شریک کرتے ہو، میں نے ہر طرف سے منہ پھیر کر اپنا رخ اسکی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور میں اسکے ساتھ کسی کو شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یہی قلبِ سلیم ہے جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی اور جو غیر اللہ کی عظمت و کبریائی کے تمام نقوش سے سادہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ یہی فطرتِ سلیم، یہی عقلِ سلیم اور یہی قلبِ سلیم رکھتے تھے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَکُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ (الانبیاء)

اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو بھی رشد عطا کیا تھا اور ہم اسکی لیاقت جانتے تھے۔

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۝ اَئِفْکًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ ۝ فَمَا ظَنُّکُمْ

اور نوح ہی کے طریقہ پر چلنے والوں میں سے ایک ابراہیم تھا جبکہ وہ اپنے رب کے حضور صاف ستھرا دل لیکر آیا۔ پھر اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ تم کس کی پرستش کر رہے ہو؟ کیا اللہ کے سوا دوسرے جعلی الہوں کے مرید بنے ہو؟ آخر رب العالمین

بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الصّٰفّٰت - ۳) کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

پھر انکو اس کی جستجو ہوتی ہے کہ اس دنیا کی آبادی اور زندگی کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرسکتے کہ جو آج زندہ ہیں وہ کل مرینگے۔ پھر کیا یہ کروڑوں ذی عقل حیوانوں کی آبادی زمین کے کیڑوں اور پانی کے بلبلوں کی طرح فنا ہوجائیگی؟ کیا یہ عظیم الشان کارخانہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ پھوٹ کر بے نتیجہ ختم ہوجائیگا؟ کیا اسکے حکیم صنّاع نے اس کو اسی بربادی کے لیے پیدا کیا ہے؟ کیا اسکی حکمت اس "فعل عبث" پر راضی ہے؟ کیا اچھے اور برے اعمال و اخلاق سب یونہی لاحاصل رہینگے جس طرح اس زندگی میں ہیں؟ کیا نیکیوں کا تخم اسی طرح مٹی میں ملا رہیگا اور بدی کا بیج اسی طرح پھلتا پھولتا رہیگا؟ وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ زندگی کا طبعی قانون ایسا ہے کہ اعمال و اخلاق کے مناسب اخلاقی نتائج ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ بارہا ظالم کو فطرت کی طرف سے اسکے ظلم کی سزا نہیں ملتی بداخلاقوں اور گناہگاروں کو انکی بداخلاقی اور گناہ کے نتائج بھگتنے نہیں پڑتے۔ نیکوکاروں اور پاکبازوں کے لیے اکثر یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہوجاتی ہے۔ تو کیا کوئی دن ایسا نہ آئے گا اور کیا کوئی ایسا نظام قائم نہ ہوگا جس میں مظلوموں کے ساتھ انصاف ہوگا؟ ظالموں کو انکے ظلم کی سزا ملیگی؟ حقداروں کو غاصبوں سے انکا حق دلایا جائیگا؟ کوششوں کا پھل کوششوں کی نوعیت کے مطابق ظاہر ہوگا؟

انکے ان سوالات اور اشکال کو بھی "وحی" حل کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ عالم ایک مرتبہ ٹوٹ کر دوبارہ بنیگا، انسان مرکر دوبارہ زندہ ہونگے، اُس نئے عالم اور نئی زندگی کا نظام اِس عالم اور اس زندگی سے مختلف ہوگا، یہاں صرف قانون طبعی کارفرما ہے، وہاں قانون اخلاقی کارفرما ہوگا یہاں جن اخلاق و اعمال کا خاصہ اور انکی فطرت ظاہر نہیں ہوئی وہاں ظاہر ہوگی، نیکوکاروں کی نیکی اور بدکاروں کی بدی انکے سامنے آئیگی، وہ سب تخم جو دنیا کی اِس کشت زار میں ڈالے گئے تھے اور مٹی کے نیچے دبے ہوئے تھے وہ اپنے اصل برگ و بار لائینگے اور انکے بونے والے انکے میٹھے

اور کڑوے پھل کھائینگے، وہ عالم اس عالم کا ایک تتمہ ہے جسکے بغیر اس عالم کی تکمیل نہیں ہوتی، جسکے بغیر اس عالم کی آفرینش ایک فعل عبث ٹھیرتی ہے، جسکے بغیر اس عالم کے اخلاقی قوانین اور احکام بے معنی اور فضول ہو جاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المومنون) | کیا تم نے سمجھا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار ہی پیدا کیا اور تم ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے؟ |
| اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ٥ ........ | جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں کیا انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم انکو اُن لوگوں کے برابر کر دینگے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے؟ انکا جینا اور مرنا یکساں ہوگا؟ یہ کیسی بری رائے قائم کرتے ہیں ........ |
| وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (جاثیہ) | حالانکہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہ کیا جائیگا۔ |

حکماء اور ماہرین علوم کا دامن اور اُنکے بڑے بڑے کتبخانے ان معلومات سے یکسر خالی ہوتے ہیں جو انبیاء کو خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ انکو آخرت کی اُن منزلوں کی ہوا بھی نہیں لگی ہوتی جنکی انبیاء علی وجہ البصیرۃ خبر دیتے ہیں اور جنکے متعلق تفصیلی ہدایات دیتے ہیں۔ انکی تگ و دو دنیا کی حد تک ہے، موت کی سرحد کے پار وہ جھانک کر دیکھ نہیں سکتے۔

| | |
|---|---|
| يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (الروم) | وہ دنیا کی زندگی کا ظاہری علم رکھتے ہیں اور آخرت سے بالکل بے خبر ہیں۔ |
| بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ | ان کا علم تھک کر رہ گیا آخرت کے بارہ میں، بلکہ |

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ وہ اسکی طرف سے شک میں ہیں بلکہ وہ اس سے نابینا ہیں۔

حکمار اور ماہرین علوم کی حقیقت انسانی سفینہ کے اِن ناخداؤں کے مقابلہ میں وہی ہوتی ہے جو ایک تجربہ کار جہاز راں کے سامنے ساحل سمندر پر خوبصورت سیپیوں کے ساتھ کھیلنے والے بچوں کی۔ ان حکمار اور علمار کے لیے بھی یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک ان پڑھ دیہاتی کے لیے ضروری ہے کہ انبیار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں اور ان سے اپنی نجات وسعادت کا وہ علم حاصل کریں جو انکے بغیر کسی سے نہیں مل سکتا، جسکے بغیر انکے تمام علوم وفنون، انکی تمام تحقیقات واکتشافات بیکار بلکہ انکے لیے وبال ہیں۔ اپنے علوم پر فخر وناز، اپنے معلومات اور تحقیقات پر قناعت اور انبیار کے علم سے استغنار انکے لیے اور ان تمام آبادیوں اور ملکوں کے لیے جو انکی رہنمائی قبول کریں اور اپنی قسمت انکے سپرد کریں، پیغام ہلاکت ہے۔ جن اشخاص یا قوموں نے اپنے زمانہ کے مروجہ علوم پر اعتماد کرکے انبیار کی تعلیم وہدایت سے بے نیازی برتی، وہ ہلاک ہوگئیں:۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔

پس جب انکے پیغمبر انکے پاس روشن نشانیاں لیکر آئے تو ان لوگوں کے پاس جو (تھوڑا بہت) علم تھا اسی پر نازاں رہے۔ آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی کی لپیٹ میں وہ آگئے۔

**انبیار کی دعوت** انبیار کرام کو جب اِس حقیقت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوجاتا ہے کہ یہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا ہے، اسی کی مملکت ہے اور اسی کے حکم سے یہ پورا نظام چل رہا ہے تو پھر وہ انسانوں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور تعجب سے دیکھتے ہیں کہ کائنات اور اسکے تمام اجزار چار و ناچار جس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور طوعاً وکرہاً جسکی فرمانبرداری کر رہے ہیں، انسان اس کائنات کے مجموعہ ہی کا ایک جزر ہونے کے باوجود اُسکے سامنے اپنے ارادہ اور خواہش سے جھکنے میں تامل کر رہا ہے۔ اگرچہ یہ بلا ارادہ اسکے سامنے جھکا ہوا ہے، اسکے تکوینی احکام وقوانین کے زیر فرمان ہے، اُسی کے حکم سے پیدا ہوتا ہے، اسیکے

حکم سے نشوونما پاتا ہے، بچہ سے جوان ہوتا ہے اور جوانی سے بوڑھا، اسی کی پیدا کی ہوئی چیزیں کھاتا ہے، اسیکے حکم سے بیمار ہوتا ہے، اسیکے حکم سے صحت پاتا ہے، غرض زندگی کی تمام ضروریات میں اور اپنے تمام جسمانی احوال میں خدا کے بنائے ہوئے نظام و قوانین کا اُسی طرح تابع ہے جس طرح جمادات و نباتات وحیوانات، لیکن جب اس سے کہا جاتا ہے کہ جس طاقت کے سامنے تو بلا ارادہ جھکا ہوا ہے اسیکے سامنے بالارادہ بھی جھک جا تو اسکو اس میں عذر ہوتا ہے ۔ انبیاء کرام نے جب پہلی حقیقت کے بالکل برخلاف یہ واقعہ دیکھا اور انہوں نے دیکھا کہ انکی انسانی برادری کے بہت سے افراد نے خالق کے بجائے اسکی بعض مخلوقات کے آگے سر جھکا یا ہے اور انکی عبادت و اطاعت اختیار کرلی ہے تو انکی زبان سے بے ساختہ نکلا:

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (آل عمران ۹)

کیا یہ اللہ کی فرمانبرداری کے سوا کسی اور کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ کے سامنے زمین و آسمان کی سب چیزیں اپنی خوشی سے یا مجبوراً جھکی ہوئی ہیں اور اللہ ہی کی طرف ان سب کو لوٹ کر آنا ہے۔

عالم کی یہی فتادگی اور کائنات کا یہی سجود ہے جو قرآن کی آیات سجدہ میں کثرت سے بیان کیا گیا ہے:

وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (النحل)

اور اللہ ہی کے سامنے زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اور فرشتے سربسجود ہیں اور ان میں خدا کے سامنے تکبر کا کوئی جذبہ نہیں، اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور اسکے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔

پس انبیاء کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی طاقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے جسکے سامنے ساری کائنات سر افتادہ ہے، کائنات کا ایسا جزو ہو کر زندگی گذارے جو اپنی حرکت اور عمل میں اسکی مجموعی حرکت و رفتار سے ہم آہنگ اور خالق کائنات اور مدبر ارض و سموات کے احکام و قوانین کے تابع ہو،

اپنی تمام غلط خواہشات سے، اختیار مطلق العنانی سے، آزادی و خود مختاری کے دعوٰی سے اور اپنے حقوق مالکانہ کے زعم سے دستبردار ہو کر اپنے کو بالکل اسکے حوالے کر دے۔ اسی کا نام "اسلام" ہے جس کی دعوت لیکر تمام انبیاء آئے۔

ظاہر ہے کہ اس "دین" اور "اسلام" (اطاعت مطلق اور تسلیم کامل) کے بعد اور اس تصور کے ساتھ کہ بالآخر پھر واسطہ اُسی سے پڑنے والا ہے (کہ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ) اور اسکے سامنے اس زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے، انسان میں مطلق العنانی اور خود مختاری کا جذبہ کسی طرح نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسکی زندگی کا نقشہ اسکے دماغ کے سانچے سے ڈھل کر نہیں نکلے گا بلکہ اسی کا تجویز کیا ہوا ہوگا جس نے کائنات کا پورا نقشہ بنایا ہے اور جو خود انسان کا بھی خالق ہے۔ اسکے اخلاق و عادات، سیاست و اجتماع اور احکام و قوانین اسکے اپنے تصنیف کردہ نہوں گے بلکہ اس کو سب خدا کی طرف سے ملیں گے۔

وحی و رسالت کے اس راستہ کے مقابل دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو اس عالم میں ایک ایسا وجود مستقل فرض کرے جس کی زندگی کا رخ کائنات کی دوسری چیزوں سے بالکل جدا ہے اور اس میں وہ کسی بالائی طاقت کے زیر فرمان، کسی آسمانی نظام کا تابع اور کسی غیر انسانی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کا راستہ ہے۔ یہ درحقیقت خدا کی اس سلطنت میں چھوٹی چھوٹی متعدد آزاد اور خود مختار سلطنتیں قائم کرنیکی باغیانہ کوشش ہے۔

**وحی و رسالت تمدن کی بنیاد ہے** انبیاء علیہم السلام انسان کو وہ ابدی علوم و حقائق، زندگی کے وہ قطعی اصول و قواعد اور معاشرت و اجتماع کے وہ بے خطا ضوابط عطا کرتے ہیں جنکی پابندی سے صحیح انسانی تہذیب ظہور میں آتی ہے اور جنکی بنیاد پر عادل اور صالح تمدن کا نشو و نما ہوتا ہے۔

تمدن اینٹ اور چونے کا، غذا اور کپڑوں کے تنوع کا نام نہیں ہے۔ نہ جبوانی تقاضوں کو

انسانی ہنرمندی سے پورا کرنے اور اسکے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنیکا نام ہے۔ تمدن اس اجتماعی زندگی کا نام ہے جس میں قدرت کے قائم کیے ہوئے حدود قائم رہیں، ہر فرد جماعت کو اس کا واجبی حق ملے، اور عقائد و اخلاق اور قانون و حکومت کے تعاون سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو جس میں انسان کو فطرت کا منشا پورا کرنے اور اپنے کمال مطلوب تک پہونچنے میں امداد ملے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وحی و رسالت کی روشنی اور انبیاء کی رہنمائی کے بغیر انسان نے جب اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ بنایا تو کبھی وہ اس کو مکمل نہ کر سکا اور اس میں وہ تناسب اور توازن نہ پیدا کر سکا جو ایک صالح انسانی تمدن کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا کے باغبان ہیں جو اس دنیا کی چمن بندی کرتے رہتے ہیں اور اسکے برگ و بار کو چھانٹتے رہتے ہیں۔ جو تمدن انکی مدد کے بغیر اُگ آئے اور انکی آبیاری اور نگرانی کے بغیر پرورش پائے وہ خودرو جنگلی درخت کی طرح ہے۔ اس میں وہ تمام عیوب اور نقائص ہونگے جو جنگل کے خودرو درختوں اور جھاڑیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ وہ میٹھے پھل دینے والے سایہ دار درخت کے بجائے کڑوے یا کسیلے پھل دینے والا خاردار درخت ہی ہوگا۔

انبیاء فطرت کے نباض اور انسانیت کے مزاج داں طبیب ہیں۔ جس تمدن کا خمیر انکی ترکیب اور انکے مشورہ کے بغیر تیار ہو اس میں کبھی اعتدال نہیں ہو سکتا۔ اُسکے مزاج کا عدم توازن کبھی نہ جائیگا۔ ایسا تمدن جتنی ترقی کریگا، اسکے چھپے ہوئے عیوب اتنے ہی نمایاں ہوتے جائینگے اور اسکی بے اعتدالیاں جو اسکی فطرت میں داخل ہیں اتنی ہی اُبھرتی جائینگی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام مشہور تاریخی تمدنوں کے عروج کا زمانہ سب سے زیادہ اجتماعی اور اخلاقی ہنگامہ و تلاطم کا زمانہ رہا ہے جس میں نظام اجتماعی کی داخلی خرابیاں اور بے اعتدالیاں سطح پر ابھر آئی ہیں۔ تمام انسانی تمدنوں کے عروج کے اسی دور میں ازدواجی تعلقات

کی خرابی، خانگی زندگی کی ابتری، جنسی اور صنفی کشاکش اور مشکلات، طبقاتی کشمکش، اخلاقی امراض اور اجتماعی بدنظمی سب سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اسکے خاتمہ کا وقت قریب ہوجاتا ہے، گویا اسکے عروج اور اسکی ہلاکت کا زمانہ ایک ہی ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ عقائد (خواہ مذہبی ہوں یا اجتماعی) تمدن کی مستحکم بنیاد ہیں۔ جس تمدن کی بنیاد چند مسلمات اور حقائق پر نہو وہ تمدن بے بنیاد اور بازیچۂ اطفال ہے۔ وحی و رسالت ہی صحیح عقائد بخشتے ہیں اور پھر انکو ثبات و استحکام عطا کرتے ہیں۔ انہیں کے ذریعہ سے انسان کو اخلاق اور اجتماع کے لیے ایسے اساسی مسلمات حاصل ہوتے ہیں جو آسمان و زمین کی طرح پایدار اور پہاڑوں کی طرح استوار رہتے ہیں۔ انہیں کی بنیاد پر تہذیب و تمدن کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اخلاق و اجتماع و معاشرت میں وہی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ جب کسی قوم کے ہاتھ سے وحی رسالت کا رشتہ چھوٹ جاتا ہے یا ابتدا ہی سے انبیاء کا دامن اسکے ہاتھ نہیں آتا، تو پھر اسکے نزدیک کوئی حقیقت حقیقت نہیں رہتی۔ بدیہیات، نظریات بنجاتے ہیں اور مسلمات اختلافی مسائل ہوجاتے ہیں۔ اسکے اجتماعی نظریات دن رات صبح شام تبدیل ہوتے ہیں۔ علمی حقیقتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اخلاقی اصطلاحات و تعریفات میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور اخلاقی فلسفے منسوخ ہوتے رہتے ہیں۔ خیر و شر اور صلاح و فساد کا کوئی معیار باقی نہیں رہتا۔ کل جو چیز اخلاق تھی آج وہ بداخلاقی شمار ہوتی ہے۔ آج جسکا نام ظلم ہے کل عین عدل بنجاتا ہے۔ حقائق اشیاء کے فرق سے ذہن ناآشنا ہوجاتے ہیں۔ اسوقت اس قوم کا قوام بگڑ جاتا ہے۔ اسکی اخلاقی حس باطل ہوجاتی ہے۔ آزادی کے پردہ میں سخت انتشار خیال اور اختلافِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس میں وہ اجتماعی فوضویت (انارکی) اور اخلاقی اباحیت پیدا ہوتی ہے جو اس قوم کا جینا دشوار کردیتی ہے اور خود اسکی تعمیر کی ہوئی جنت ارضی کو اسکے لیے جہنم اور اسکو دنیا کی دوسری قوموں اور تہذیبوں کے لیے طاعون بنادیتی ہے۔

تمام انسانی تمدنوں اور تہذیبوں کی تاریخ پڑھ جائیے۔ انکے اجتماعی اور اخلاقی امراض و مہلکات اور بالآخر انکی ہلاکت و تباہی کا اصل سبب مذہبی و اخلاقی عقائد و نظریات کا یہی تنزل، مسلّمات کا یہی فقدان، اور خیر و شر کے معیاروں کا یہی تغیر و تبدل پایا جائیگا۔ فطرت سلیم، قومی روایات، اور قدیم تربیت کچھ دنوں ضرور اسکی حفاظت کرتی ہیں، مگر یہ بہت کمزور قسم کی چیزیں ہیں۔ یہ قوم کے بحران اور بد اخلاقیوں اور بد نظمیوں کے سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بد اخلاقیوں اور بد نظمیوں کی پشت پر انکو جائز اور مستحسن قرار دینے کے لیے مختلف قسم کے اخلاقی اور اجتماعی فلسفے اور علمی نظریے ہوتے ہیں جنکی طاقت فطرت کی آواز کو دبا دیتی ہے اور قومی روایات اور تہذیب کے طلسم کو بھی توڑ دیتی ہے اور رفتہ رفتہ اس قوم کا دامن ہر قسم کے مسلّمات اور ہر ایسی چیز سے خالی ہو جاتا ہے جو خیر و شر اور اخلاق و بد اخلاقی کی جانچ کے لیے میزان و معیار کا کام دے سکے۔

اسی طرح وحی و رسالت کی تعلیمات سے انحراف یا ان سے لاعلمی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس زندگی کا تخیل خالص مادی اور انسان کا اپنے متعلق نقطۂ نظر خالص حیوانی ہو کر رہ جائے، اسلیے کہ انسان کے پاس اپنے طور پر جتنے ذرائع معلومات ہیں وہ اسکے سوا اور کوئی اطلاع نہیں دیتے۔ اُن سے اس زندگی کے سوا کسی اور زندگی کا پتہ نہیں چلتا، اور مجرد حس اور مشاہدہ سے انسان کی اور کوئی حقیقت اس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ایک "بولنے والا جانور" (حیوان ناطق) ہے۔ یہ عقیدہ اور اعتراف طبعی طور پر انسان کو حیوانیت کے اُس مقام پر پہونچا دیتا ہے جہاں جسمانی لذت و الم کے احساس کے سوا کوئی اخلاقی شعور اور اغراض و مصالح کی پرستش کے سوا کوئی مذہب و فلسفہ نہیں رہتا۔

نبوت ہی انسان کو اپنی برتری و شرافت اور انسانیت کا شعور بخشتی ہے اور اسکے ساتھ یہ ادراک بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک مقتدر اعلیٰ، احکم الحاکمین کے زیر فرمان ہے، اسکے سامنے اپنے تمام اعمال و اخلاق کے لیے جوابدہ ہے، یہ دنیا اسی کی سلطنت اور اس دنیا کے رہنے

والے اسی کے بندے ہیں، وہ اس سلطنت میں تصرف کرنے اور اس دنیا کے رہنے والوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں آزاد نہیں ہے۔

پھر نبوت صرف اخلاقی حس کے بیدار کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ انسان کو ایک نظام نامہ اور مفصل ضابطہ اخلاق دیتی ہے، اچھے اخلاق پر اُس سے خدا کی رضا اور اسکی خوشنودی کے محل و مقام کا وعدہ کرتی ہے جس سے بہتر عمل کے لیے کوئی محرک ثابت نہیں ہوا، بداخلاقیوں اور قانون شکنی پر اسکے عذاب اور قہر سے ڈراتی ہے جس سے زیادہ کامیاب مانع دنیا میں موجود نہیں، خدا کے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر اور عالم الغیب والشہادہ ہونیکا یقین اسکے دل و دماغ میں پیوست کر دیتی ہے جس سے بڑھکر انسان کو ضبط میں رکھنے والی کوئی اخلاقی طاقت آج تک دریافت نہیں ہوسکی۔ یہی طاقت ہے جو انسان کو جلوت و خلوت شہر اور صحرا میں پابند قانون رکھتی ہے، جو پولیس اور فوج کی طاقت کے بغیر بڑے بڑے جرائم اور صدیوں کی بری عادات کا استیصال کر دیتی ہے، جو زبان کے ایک اشارہ سے پوری پوری قوم سے منہ لگی شراب چھڑا دیتی ہے، جو مجرموں کو شہروں اور صحراؤں سے کھینچ کر عدالت میں حاضر کرتی ہے اور انکی زبان سے اپنے جرم کا اقبال کراتی ہے۔

جس اخلاقی نظام کی پشت پر نبوت کی یہ طاقت نہ ہو وہ صرف کتابی فلسفہ ہے جو ایک معمولی سے جرم کا انسداد بھی نہیں کرسکتا[1] اور محدود سے محدود رقبۂ زمین میں بھی کوئی پاکیزہ اخلاقی ماحول نہیں پیدا کرسکتا

[1] اسکی بہترین مثال امریکہ کی تحریک منع خمر کی ناکامی اور قانون تحریم خمر کی منسوخی ہے۔ اس تحریک اور قانون کی پشت پر دنیا کی ایک عظیم ترین اور منظم ترین حکومت (ریاستہائے متحدۂ امریکہ)، بے پایاں دولت و سرمایہ، اعلےٰ علم و تہذیب اور لا انتہا وسائل نشر و تبلیغ تھے۔ اندازہ ہے کہ شراب کے خلاف نشر و اشاعت کے سلسلہ میں صرف چھ سال کے اندر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوئے اور وہ لٹریچر جو شائع کیا گیا وہ نو ارب صفحات پر مشتمل تھا۔ قانون کی تنفیذ کے سلسلہ میں تیرہ سال کے اندر دو سو آدمی مارے گئے۔ ۵۳۴۳۳۵ قید کیے گئے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کے جرمانے عائد کیے گئے۔ چالیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ مالیت کی املاک ضبط کی گئیں۔ لیکن ان انتہائی کوششوں کے باوجود امریکہ کی حکومت و قانون اور اس کے اصلاحی ادارے اور انجمنیں اہل ملک کو قانون کی پابندی اور شراب نوشی سے اجتناب پر آمادہ نہ کرسکیں بلکہ اس کے برعکس ان میں مے نوشی کا جنون پیدا کر دیا اور بالآخر خود ہی سنہ ۱۹۳۳ء میں جمہوریت کو مجبوراً اس قانون کو منسوخ اور شراب نوشی کو جائز قرار دینا پڑا (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "تنقیحات"، مضمون "انسانی قانون اور الٰہی قانون")

جو تمدن اس آسمانی ضابطۂ اخلاق سے محروم ہو اور جس قوم کا پہلو اس مذہبی ضمیر سے خالی ہو وہ دنیا ہی میں جہنم کے گڑھے کے کنارے کھڑی ہے۔ اسکی مادی و علمی ترقی، اسکی صنعتی و سیاسی فتوحات، اسکی تسخیر کائنات، اسکی ظاہری تہذیب و آداب، اسکے علوم و فنون غرض کوئی چیز اسکو اس گڑھے میں گرنے سے روک نہیں سکتی۔ بلکہ یہ سب چیزیں مل کر اسکے گرنے کی رفتار کو اور تیز کر دینگی۔ جو قوم وحی کی حفاظت اور انبیاء کی پاسبانی سے محروم ہو اسکے یہی علوم و آداب (جو انبیاء کی رہنمائی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں اور جنکا ضمیر خدا شناس اور پاکباز نہیں ہے) اسکے اخلاقی زوال میں معاون اور اسکے سرگرم کارکن بنجاتے ہیں، اور فواحش کی تبلیغ و اشاعت میں، بے حیائی اور بد اخلاقی کو فروغ دینے میں، تہذیب و حیا کے پرانے نظریات کو بدلنے اور انکو معیوب قرار دینے اور جرائم و فواحش کو مزین و آراستہ کرنے میں شیطان کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ یونان و روم اور جدید یورپ کی اجتماعی و اخلاقی اور ادبی تاریخ اسکی شاہد ہے۔

انسان کی آزادی کی اس راہ میں قانون سنگ گراں ثابت ہو سکتا تھا مگر اسکو انسان نے اپنے راستے سے اس طرح ہٹا دیا کہ وہ خود واضع قانون بن گیا۔ جب قانون کا ماخذ و منبع بجائے کتاب آسمانی اور وحی الٰہی کے انسانی علم و تجربہ قرار پایا اور قانون ساز بجائے خدا کے انسانوں کی کثرت رائے یا طاقت تسلیم کی گئی تو راستہ کی تمام رکاوٹ دور ہو گئی۔ انسان کی ترکیب میں شہوانیت اور بہیمیت داخل ہے وہ فطرۃً بندشوں اور قیود سے آزاد رہنا چاہتا ہے۔ وہ بالطبع لذت جو، اور عیش پسند ہے۔ جب اسکے ساتھ خدا کا خوف اور اپنی ذمہ داری کا احساس بھی نہ ہو تو اسکو کونسا محرک ایسا قانون بنانے پر آمادہ کر سکتا ہے جو خود اس پر بندشیں اور قیود عائد کرے، اسکی آزادی سلب کرے اور اسکے عیش کو منغص کر دے۔ پھر جب یہ قانون ساز انسان ہوں جنکی پرورش ان متزلزل عقائد، ان معکوس نظریات، اس مسخ شدہ ذہنیت اور ان فاسد اخلاق میں ہوئی ہو جنکا اوپر تذکرہ ہوا تو ان سے ایسے قانون وضع

کرنے کی توقع کہاں تک بجا ہے جو جرائم کا انسداد کرے اور جس میں معصیت اور فواحش اور بداخلاقیوں کے گھسنے کے لیے کوئی رخنہ نہ ہو۔ ان سے تو یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی قانون سازی کی طاقت اور اپنے اقتدار سے بداخلاقیوں کو سند جواز اور قانونی حیثیت دینگے، انکے دور میں بداخلاقیاں قانون بنجائینگی[1] اور اخلاق خلاف قانون قرار پائینگے۔ مسخ و نیم مسخ شدہ قوموں کی تاریخ میں یہ واقعہ شاذ نہیں ہے کہ بڑے بڑے جرائم رائے عامہ کی طاقت سے جائز و مستحسن اور مقبول عام بن گئے، پاکبازی سوسائٹی کا جرم بنگئی، پاکبازوں کے لیے اس مجرم سوسائیٹی میں رہنے کی گنجائش نہ رہی، اور رائے عامہ نے یہی الزام دیکر انکے اخراج کا مطالبہ کیا کہ:-

أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّن قَرْيَتِكُمْ — لوط کی جماعت کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ

إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ - — وہ لوگ ہیں جو پاکباز رہنا چاہتے ہیں۔

نبوت دنیا میں جو تمدن قائم کرتی ہے اسکی یہ خصوصیت ہے کہ وہ قانون سازی کا حق انسان کو نہیں دیتی۔ اسکے تمدن میں انسان گنہگار ہو سکتا ہے اور خلاف قانون بھی کرسکتا ہے۔ اسکو اسکے تمدن میں اس کی سزا برداشت کرنی پڑے گی۔ لیکن وہ قانون الٰہی میں ادنیٰ ترمیم کا بھی مجاز نہیں، اسکے حلال و حرام، زمین و آسمان اور سورج اور چاند کی طرح پائدار اور نوامیس فطرت کی طرح غیر متبدل ہیں، بلکہ وہ عین فطرۃ ہیں جس میں تغیر و تبدل نہیں۔

فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا — اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کے

تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ — بنائے ہوئے کو کوئی بدل نہیں سکتا، یہی استوار اور پائدار دین ہے۔

[1] تاریخ جدید میں بھی اسکی مثالیں ملتی ہیں کہ قانون سازی کی طاقت اور کثرت آرا سے بعض ایسے اخلاقی و اجتماعی جرائم جنکی شناعت پر نوع انسانی کا اتفاق ہے قانوناً جائز قرار دیے گئے۔ زیادہ دنوں کا واقعہ نہیں نازی دور سے پہلے کی بات ہے کہ جرمنی میں چھ سال تک عمل قوم لوط کے حق میں پروپیگنڈا کیا گیا۔ یہ زبردست اصلاحی کام اُن بزرگ سٹنیر جو دنیا کی مجلس اصلاح صنفی کے صدر رہ چکے تھے۔ آخر کار ملک کی مجلس قانون ساز نے کثرت آرا سے یہ پاس کر دیا کہ یہ فعل قانوناً جرم نہیں ہے صرف شرط یہ ہے کہ طرفین راضی ہوں اور معمول کے نابالغ ہونے کی صورت میں اسکا ولی ایجاب و قبول کی رسم ادا کر دے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رسالہ "پردہ" میں اسکی اور بھی مثالیں ملیں گی۔

اس لیے اسکے تمدن میں فواحش ومحرمات، معاصی ومنکرات، عیش وعشرت کے محرکات، لہو ولعب اور غفلت کے اسباب اور تمام اخلاقی جرائم اور جرائم آفریں اعمال واشغال ہمیشہ ممنوع رہینگے، اور جب تک انکی فطرت اور انسان کی فطرت نہ بدلے ـــــ اور ان میں سے کوئی چیز بدلنے والی نہیں ـــــ ان کا حکم بھی نہ بدلے گا۔

انسانی قوانین کا مقصد صرف کسی خاص نظام کی تاسیس، امن عامہ کی حفاظت اور اہل مملکت میں نظام قائم کرنا ہوتا ہے، اسلیے وہ انسان کے اُن اعمال واخلاق سے بحث کرتے ہیں جو سوسائٹی اور عام زندگی پر اثر انداز ہوں۔ انکو شخصی اخلاق اور اندرونی خرابیوں سے بحث نہیں ہوتی۔ اِن قوانین کی حیثیت ایک معلم اخلاق اور مصلح کی نہیں ہوتی بلکہ پولیس اور مجسٹریٹ کی ہوتی ہے۔

لیکن آسمانی قوانین کا مقصد محض نظم قائم کرنا نہیں ہے بلکہ انسانوں کو پاکباز اور خدا ترس بنانا ہے۔ اسلیے اُن کے ضوابط میں بعض ایسی چیزیں، ایسے اخلاق اور ایسے مشاغل ممنوع ہونگے جنکی طرف دنیوی قانون سازوں کا ذہن ہی نہ جائیگا۔ ان میں ایسے تمام رخنے بند ہونگے جن سے معصیت وبداخلاقی سوسائٹی میں داخل ہوتی ہے، جن سے طبیعتوں میں عیش پسندی آتی ہے، جن سے قوم میں تن آسانی اور تنعم پیدا ہوتا ہے، غیر اخلاقی رجحانات اور مجرمانہ میلانات پیدا ہوتے ہیں، جن سے سوسائٹی کو گھن لگتا ہے جو اندر ہی اندر اسکی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ایسی سب چیزیں ممنوع ہونگی جو اسکے اخلاقی معیار سے مطابقت نہیں رکھتیں یا اسکے مذہبی اصول سے موافقت نہیں رکھتیں۔ اسکا تمدن موسیقی کی ہمت افزائی نہیں کریگا، لہو ولعب اور تفریح میں انہماک کو پسند نہ کریگا، زینت وتفاخر اور مال ودولت کے مقابلہ کو اچھی نظر سے نہ دیکھیگا، یہانتک کہ بے سود اور غیر ضروری تعمیرات جنکا مقصد شان وشوکت کے اظہار اور لطف وتفریح کے سوا کچھ نہو، اُس تمدن میں مذموم ہونگی، سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال مطلق اور انکے زیورات اور ریشم کا استعمال مردوں کے لیے

ممنوع ہوگا، تصاویر اور پتھر کے بت اور انسانی مورتیں مطلقاً حرام اور ممنوع ہونگی۔

انسانی قوانین میں صرف لفظی پابندی ضروری ہوتی ہے اور جرائم سے مانع صرف سزا یا پولیس کا خوف ہوتا ہے۔ جہاں یہ موانع موجود نہ ہوں وہاں جرائم کے ارتکاب میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ دلوں میں قانون کی عظمت اور اسکا احترام نہیں ہوتا اسلیے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جن کی تقدیس کا کوئی تخیل لوگوں کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ اکثر قانون ساز اقتدار اور قانون سازی کے منصب پر اپنی ذکاوت یا دولت یا طاقت یا انتخابی کوششوں کی وجہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور اخلاقی حیثیت سے انکی سطح اور اصولی حیثیت سے انکی سیرت عام لوگوں کے مقابلہ میں کچھ بلند نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات وہ سخت بداخلاق، بے اصول، طامع، رشوت خوار اور رذیل ہوتے ہیں، اس لیے بعض اوقات تو وہ اپنے اغراض و فوائد کے لیے اپنی کمزوریوں اور بداخلاقیوں کو قانونی سند دینے کے لیے اور بعض اوقات عوام اور رائے دھندوں کی خوشامد کے لیے خلاف اصول قوانین بناتے ہیں اور ان میں حسب مصلحت و خواہش ترمیمیں کرتے رہتے ہیں۔ عوام ان کے قوانین کو بجبر قبول کرتے ہیں اور ان میں ایک بڑا طبقہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ذکاوت اور حیلہ جوئیوں سے انکو عاجز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور قانون اور اہل ملک کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے۔

اسکے برخلاف وحی و رسالت کا لایا ہوا قانون خدا اور رسول پر ایمان رکھنے والوں کے لیے اسی درجہ مقدس اور قابل عزت ہوتا ہے جس درجہ ان کا مذہبی صحیفہ اور خود انکا پیغمبر۔ وہاں اسکو اپنی ہوشیاری سے ہرانے، عاجز و مغلوب کرنے اور اسکو تنگ اور دق کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ یہ عمل عین کفر اور بغاوت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ — بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ہرانے کی کوشش کی

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ (سبا) — انکے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے۔

وہاں صرف قانون کی لفظی پابندی اور ظاہری وجسمانی شکل کافی نہیں بلکہ پابندی قانون کی روح بھی ضروری ہے کیونکہ قانون ساز اور حاکم (اللہ) غیب سے واقف ہے، ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے، اور اسکو ظاہری قانونی پابندی سے دنیا کے حاکموں کی طرح دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا — ان قربانیوں کے گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہونچے

وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ — بلکہ تمہارا تقویٰ پہونچتا ہے۔

جو قانون ان خصوصیات کا مالک ہوگا، اسکے تمدنی اثرات کیا ہوں گے؟ وہ سوسائٹی میں کس درجہ کی پاکبازی، طہارت وعفت، امانت ودیانت، تہذیب وحیا پیدا کریگا؟ اور جب ان لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت آئیگی اور انکو زمین کے کسی حصہ میں اقتدار حاصل ہوگا جو مذہب واجتماع واخلاق اور معاشرت وتہذیب کے بارہ میں ایسے ثابت شدہ حقائق، ایسے غیر متزلزل عقائد رکھتے ہیں جو انکو علم واطلاع کے ابدی اور دائمی صاف اور محفوظ سرچشمہ سے حاصل ہوئے ہیں اور جو فطرت کے اٹل قوانین کی طرح غیر متبدل اور غیر منسوخ ہیں، جنکی تربیت ان اخلاق میں ہوئی جو انسانی ہوا وہوس سے پاک اور خدا کی صفات کا پرتو ہیں، جنکا قانون شریعت الٰہی کا دوسرا نام ہے، جو قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (عدل وانصاف کے ذمہ دار اور ملتزم اور اللہ کے گواہ) ہیں، تو انکی حکومت واقتدار کے نتائج وثمرات کیا اس سے مختلف ہونگے جسکی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ — یہ وہ لوگ ہیں جنکو اگر ہم زمین میں صاحب اقتدار

أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا — کریں تو وہ نماز کو قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے بھلائی

بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (الحج) — کا حکم کرینگے اور برائی سے روکیں گے۔

اور ان سے طبعی طور پر جو تمدن اور طرز زندگی وجود میں آئیگا، کیا اسکی پاکبازی اور بلندی میں کسی کو

شک ہو سکتا ہے؟ اسکے برخلاف جو تمدن ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو اور جو سوسائیٹی ان کے ذریعہ وجود میں آئے جو مذہب، اخلاق واجتماع اور تہذیب انسانی کے یا تو سرے سے کچھ حقائق و مسلمات ہی نہ رکھتے ہوں یا ان کے پاس چند ذوقیات اور وجدانیات ہوں، جنکی تقویم سورج کی گردش کے ساتھ بدلتی رہتی ہو، جنکے پاس خیر و شر اور مذموم و مستحسن کی تمیز کے لیے کوئی پائیدار معیار اور اخلاقی قدروں کے وزن کرنیکے لیے کوئی عادل میزان نہو، جنکے یہاں اخلاق، اغراض و مصالح کا نام ہو اور جنکا قانون خود انہیں کا بنایا ہوا اور انکے علم و تجربہ اور ضرورت و مصلحت کے تابع ہو، جنکی حکومت شخصی یا نسلی یا قومی اقتدار کا ذریعہ اور اسکی خادم ہو، اور اسکا دنیا میں کوئی اصلاحی مشن نہو، جسکی بنیاد کسی اصول اور اخلاقی فلسفہ پر نہو، تو اس تمدن اور اس سوسائیٹی میں کیا انسان کو اپنی فطرت کا منشا پورا کرنے اور اپنے کمال مطلوب تک پہونچنے میں امداد مل سکتی ہے؟ اور اگر اس نے کچھ عمر پائی، اور اسکی جڑیں زمین میں گہری چلی گئیں تو کیا انسان اپنی فطرت اصلی پر قائم بھی رہ سکیگا، اور اسکو اپنا کمال مطلوب یاد بھی رہیگا؟ اس تمدن کو انسانی تمدن کہنے کی وجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں نے قائم کیا ہے جو اپنی شکل و صورت میں انسان ہیں اگرچہ وہ اپنے طرز زندگی میں بے جان مشینیں، اپنی ذہنیت اور تربیت کے لحاظ سے بے شعور جانور اور اپنے مشاغل و اعمال کے لحاظ سے خونخوار درندے ہیں۔

---